بنیاد جلد ۵، ۲۰۱۴ء

محمد شمیم حنفی

محمد شمیم حنفی*

بھارت میں اردو : ایک ہندوستانی تناظر

ہندوستان، جسے اس کانفرنس کے دعوت نامے میں بھارت کہا گیا ہے، نام کی اس بہ ظاہر بے ضرری تبدیلی کے ساتھ، میرے لیے اس کا مفہوم اور تہذیبی سیاق بھی بدل جاتا ہے۔ یہ ایک حساس موضوع ہے اور آج کی دنیا کے بیشتر انسانی تجربوں کی طرح اس موضوع سے منسلک تجربہ بھی بالآخر ایک سیاسی جہت اختیار کر لیتا ہے۔لہٰذا اس موضوع کے ساتھ کئی پیچیدگیاں اور جذباتی مسئلے بھی سر اُٹھانے لگتے ہیں۔ یہ وقت اس مسئلے کی تفصیل میں جانے کا نہیں، اس لیے آپ کو ڈیریک والکاٹ[1] کی ایک نظم کے کچھ مصرعے سنا کر میں اپنے موضوع کی طرف بڑھتا ہوں۔

میں
کہ جس میں لہو کی دو دھاراؤں کا زہر
بھرا ہوا ہے
میں کس طرف جاؤں
میری تو رگیں بھی پھٹی ہوئی ہیں!

میرے لیے، اپنے ملک میں اردو کا کوئی تصور، پاکستان کو دھیان میں لائے بغیر، مکمل نہیں ہوتا۔ اردو زبان میرے لیے اپنی ادبی اور لسانی دنیا کی پہچان کا سب سے فطری اور آسان راستہ ہے۔

یہ دنیا ہندوستان اور پاکستان دونوں سے بڑی ہے اور اس دنیا کے ان دو سب سے نمایاں اور طرح طرح کے سوالوں میں گھرے ہوئے علاقوں کے درمیان، اردو ایک پل بھی بناتی ہے، میرے لیے درد کا ایک رشتہ بھی قائم کرتی ہے۔ درد کے اسی رشتے نے اس پیاری اور دکھیاری زبان اردو کی ادبی روایت کو، زبانوں کے اس عجائب گھر میں جسے آپ چاہے ہندوستان کہیں یا بھارت، آج کی دنیا کے لیے اتنا ثروت مند اور پرکشش بنایا ہے۔ فراق اور فیض، بیدی اور منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین، کمار پاشی اور نسرین انجم بھٹی، ہر سمجھ دار شخص کے لیے، ایک ہی بستی کے مکین ہیں۔ ایک ہی فضا میں سانس لینے والے۔ انھوں نے یہ ساری زمین اور زمانے، اس کے سب اندھیرے اور اجالے آپس میں بانٹ لیے ہیں۔ ان کی میراث ایک ہے۔

اس کے علاوہ، یہ بات بھی ہے کہ ادب اور فنون، علوم اور تصورات کی دنیا میں سیاسی، ثقافتی اور نظریاتی تقسیم کا سلسلہ زیادہ دور تک نہیں چلتا۔ غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ کے جس موڑ پر اردو کے بیج بوئے گئے تھے، اس کی شناخت تہذیبی وحدت اور کثرتیت کے ایک ناگزیر عنصر سے ہوتی ہے۔ یہی عنصر اس پورے منظر نامے کا محرک اور معمار ہے۔ اپنی ایک تقریر میں اقبال نے کہا تھا۔

> وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کردیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہوگا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کرسکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔[۲]

۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد کی پراگندہ ذہنی فضا اور حواس باختہ ماحول میں، عسکری صاحب نے اپنے کالم میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:

> اگر مسلمانوں کی کوئی کلچری زبان ہندوستان میں ہوسکتی تھی تو وہ فارسی تھی، لیکن انھوں نے فارسی کو چھوڑ، اس ہندوستانی زبان کو ایسا اپنایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا کلچر اردو زبان کا اسیر ہو کے رہ گیا۔ اردو زبان سے عظیم تر کوئی چیز ہم نے ہندوستان کو نہیں

> دی۔ اس کی قیمت تاج محل سے بھی ہزاروں گنی زیادہ ہے۔ ہمیں اس زبان پر فخر ہے۔ ہمیں اس کی ہندوستانیت پر فخر ہے، اور ہم اس ہندوستانیت کو عربیت یا ایرانیت سے بدلنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں۔[۳]

یہاں ہندوستانیت کو ایک بلیغ تہذیبی استعارے میں منتقل کرنے والی چیز دراصل وحدت کا وہی تصور ہے، جس کی طرف علامہ نے اپنے نشریے میں اشارہ کیا تھا۔ بنی نوع انسان کی وحدت کا خیال، بہر حال کثرتیت یا pluralism کی قدر کا تابع اور پابند ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی سرزمین پر، جو اپنی لسانی، ثقافتی اور مذہبی رنگا رنگی کے باعث، اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتی ہے، اردو جیسی زبان کا پیدا ہو جانا، اور پھر اس کا ایک ہمہ گیر تہذیبی اور فکری روایت سے ہم آہنگ ہو جانا فطری تھا۔ اردو ہندوستان کی بائیس قومی زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ ریاستی، دفتری زبان کی حیثیت اسے صرف ایک صوبے میں دی گئی ہے۔ اس کا اپنا کوئی متعین علاقہ نہیں ہے۔ یہ کسی خاص مسلک، قوم، فرقے کی زبان بھی نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ شمالی ہندوستان کے عام تعلیم یافتہ طبقے کی زبان تھی اور اسے ایک نمایاں تہذیبی برتری حاصل تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے اپنی مادری زبان کہا تھا۔ یہاں بسنے والی کسی قوم کے لیے اردو بدیسی اور اجنبی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال نے اردو کے وسیع اور سیکولر مزاج کی تشکیل میں ایک غیر مبہم رول ادا کیا ہے اور اسے ایک منفرد توانائی بخشی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وقت کے بہاؤ نے اردو لیے کچھ مشکلیں بھی پیدا کی ہیں۔ برصغیر کی لسانی سیاست نے اردو کے بارے میں طرح طرح کی غلط گمانیاں پھیلائی ہیں۔ لہٰذا ہماری اجتماعی تاریخ اور مشترکہ تہذیب کی بیلنس شیٹ میں اب خسارے کا احساس کامیابی کے احساس پر حاوی نظر آتا ہے، اور اس احساس تک رسائی کا ایک راستہ، ہمارے یہاں اردو کی صورتِ حال اور اردو کو درپیش مسئلوں کی روداد سے ہو کر بھی جاتا ہے۔ اس طرح، آنے والے دنوں میں، اردو کے لیے جو صورتِ حال پیدا ہوگی، وہ اس کی موجودہ صورتِ حال سے شاید بہت مختلف نہ ہوگی۔ وہی لسانی فرقہ پرستی اور توسیع پسندی، وہی عدم رواداری اور علاحدگی پسندی، دونوں طرف اردو کے جمہوری اور سیکولر مزاج کو نظر انداز کرنے کی وہی روش، اقتدار کے مراکز کی وہی بے حسی، جس نے اردو کشی کی شکل اختیار کرلی ہے، اور اردو والوں کی

وہی باہمی چپقلش، بے عملی اور اپنے حالات کے لیے بس دوسروں کو قصوروار ٹھہرانے کی عادت۔غرض کہ عملی مشکلات اور مسائل کی ایک لمبی فہرست ہے۔ادھر کچھ عرصے سے انگریزی بنام علاقائی زبانوں کا ایک نیا قضیہ کھڑا ہوا ہے، اور اس تاثر میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے کہ کم و بیش تمام زبانوں کو، انگریزی کی شکل میں مفروضہ ذہنی غلامی کے ایک نئے مسئلے سے نمٹنا ابھی باقی ہے۔کولونیل مائنڈ سیٹ کی بالا دستی کے زمانے میں، وہ جو ایک بے چین کرنے والا احساس جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ وحشیوں کو متمدن بنانے کا جوکھم انگریزی دانوں کو ہی اٹھانا ہوگا اور تاریخ، زبان، ثقافت، تینوں کے پس منظر میں انھیں کو ایک موثر رول ادا کرنا ہوگا، اب اس کے ردعمل کی جذباتی صورتیں بھی ہمارے یہاں مختلف سطحوں پر نمودار ہو رہی ہیں۔اس مسئلے کا شور اردو سے زیادہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، ملیالم، تمل اور کنڑ کے ادبی معاشرے میں سنائی دیتا ہے۔اس کی وجہ صاف ہے۔لسانی سطح پر اردو اپنے خلاف پھیلے ہوئے تعصبات اور آپ اپنے معاشرے کی بے حسی اور بے عملی سے پیدا ہونے والے مسئلوں میں بھی الجھی ہوئی ہے اور اردو کے نادان دوست اس کا دائرہ تنگ کرنے پر بھی مصر ہیں۔وہ اسے ایک exclusive اور سخت گیر زبان بنانا چاہتے ہیں۔کیا یہ اردو کشی کی ایک شکل نہیں ہے؟ مگر، جیسا کہ جزیرے کے اختتامیے میں عسکری صاحب نے کہا تھا اور کتنے دوٹوک انداز میں کہا تھا کہ:

> اگر ہمیں اپنے ادب کو انسانی ترکہ کا ایک حصہ بنانا ہے تو ہم زیادہ عرصے تک، اپنے آپ کو زمان و مکان میں محدود نہیں رکھ سکتے۔ادب میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں نہیں بن سکتیں۔اگر ہم اردو میں صرف نئی نئی راہیں کھول دینے پر ہی مطمئن نہیں ہیں، بلکہ واقعی ''سونے کی سرزمینیں'' فتح کرنا چاہتے ہیں تو جلد یا بدیر، ہمیں نہ صرف اپنے پیش روؤں سے، بلکہ ساری دنیا کے بڑے بڑے نثرنگاروں اور شاعروں سے، اپنا مقابلہ کرنا پڑے گا۔اس مقابلے اور موازنے سے پہلو بچانا گویا اپنے قد کو بڑھنے سے روکنا ہے۔[۴]

اس خیال کی روشنی میں ہمارا ذہن ایک ساتھ دو ضروری باتوں کی طرف جاتا ہے۔ایک تو یہ کہ اردو جس نے ہندوستان کے پیچیدہ سیاسی نقشے میں اپنے سر پر تاریخ کا ایک خاص بوجھ بھی اٹھا رکھا ہے، اسے چار و ناچار، ایک تو اس تاریخی حقیقت کی پیدا کردہ مشکل سے نکلنا ہوگا، دوسرے یہ کہ اسے

اپنی ثقافتی برتری اور خوش فہمی کے اس دائرے کو بھی توڑنا ہوگا جس نے خاص کر ہمارے نئے لکھنے والوں کی اکثریت کو نرگسیت (narcissism) کی مہلک بیماری میں مبتلا کر رکھا ہے۔انیسویں صدی تک دلی اور یوپی کے اردو والوں میں یہ مرض عام تھا۔اردو معاشرہ ان دنوں پہلے سے زیادہ خودنگر اور خود پرست ہو گیا ہے اور اپنے دارالاماں سے آگے دیکھنے کا رواداری کم ہی دکھائی دیتا ہے۔مقام شکر ہے کہ ہماری زبان میں ابھی آج اور دنیا زاد جیسے رسالے نکل رہے ہیں اور ذہن جدید نے ادب کو آرٹ اور تھیٹر کی ہمہ جہت دنیا سے جوڑے رکھنے کی مہم چلا رکھی ہے۔اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ یہ ایک تہذیبی فریضے کی ادائیگی بھی ہے جو اردو کی بنیاد اور بقا کے ساتھ وابستہ ہے۔حضرت امیر خسرو سے لے کر استاد امیر خاں تک اور استاد منصور سے لے کر ایم۔ایف۔حسین اور طیب مہتہ تک، دیویکا رانی اور سہراب مودی سے لے کر دلیپ کمار اور عامر خاں تک، پنڈت دینا ناتھ زتشی سے لے کر ضیاء محی الدین تک، سب اردو تہذیب کے پروردہ ہیں۔

اصل میں زبان، ادب اور آرٹ کا دوسرا نام جذبے، احساس، خیال اور تجربے کی آزادی بھی ہے۔چھوٹی چھوٹی وابستگیاں اور حد بندیاں انھیں راس نہیں آتیں۔اردو نے اپنے دروازے جب تک بیرونی اثرات کے لیے کھلے رکھے اس کا دائرہ مسلسل پھیلتا رہا۔فکری اور لسانی، دونوں سطحوں پر۔یہاں تک کہ اردو نے ہندوستان میں سب سے زیادہ کثرت سے سمجھی جانے والی زبان (لنگوا فرینکا) کی حیثیت اختیار کر لی۔روزمرہ اظہار اور میڈیا کی زبان کے طور پر اردو کو ہندوستان کے مختلف علاقوں اور قوموں میں جو قبولیت ملی، اسی رواداری اور جمہوری رویے کی بنا پر ملی۔دکنی اردو اور اٹھارویں صدی تک شمالی ہندوستان میں بھی ادبی اظہار کی سطح پر اردو کا رشتہ، آس پاس کی زندگی اور اپنے طبعی و جغرافیائی ماحول سے بہت مستحکم رہا۔جیسے ہی اس کشادہ نظری کی جگہ لسانی سخت گیری، ملت پرستی اور اشرافیت کے ایک مصنوعی رویے نے لی، اردو کا دائرہ سمٹنے لگا۔اردو کی بنیادیں میلے ٹھیلے، عوامی تقریبات اور بازار سے وابستگی نے بچائے رکھیں۔اردو والوں نے دکنی اردو کو قبول کرنے کے بعد بھی ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانِ خاناں اور سنت کبیر کی زبان کو اپنانے سے گریز کیوں کیا، اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔پنجابی، سندھی، اودھی میں شعر کہنے والے صوفی سنتوں میں دیندار مسلمان بھی تو موجود تھے۔

ہندوستان کی مختلف بولیوں کے خزانے سے خود کو دور رکھ کر اردو نے اپنا نقصان کیا ہے۔ اس کی قیمت اردو کو آج تک چکانی پڑ رہی ہے۔

لسانی اختصاص اور تکلفات کے رویے اردو کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے۔ دکنی اردو کے خطوط پر پنجابی اردو، بنگالی اردو یا اردو کے روایتی مراکز سے آگے مختلف علاقوں کی اردو کے کئی رنگ ایک ساتھ سامنے آنے چاہیے تھے۔ زبان کی معیار بندی کا مسئلہ اس عمل میں حارج نہیں ہوتا کیونکہ زبان ایک ساتھ تہذیب اور ثقافت کے کئی دائروں میں سفر کرتی ہے۔ لیکن لسانی مراکز میں پنپنے والے جھوٹے پندار نے ایک مہلک لسانی تعصب کی شکل اختیار کر لی۔ اس تعصب کے نتیجے میں، اردو کے خلاف لسانی، ادبی اور تہذیبی یا سیاسی اختلافات کی زمین سے اٹھنے والے، طرح طرح کے محاذ بنتے گئے۔ کشمیر، پنجاب، بنگال، سندھ کے حالات کا جائزہ اردو کے سیاق میں لیا جائے تو ایک پریشان کن صورتِ حال کا خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ حالات تاریخ کے علاوہ جغرافیائی وحدت میں انتشار پیدا کرنے کا سبب بھی بنے ہیں اور برِ صغیر کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

اسی طرح یہ حقیقت بھی، کہ اردو کو اپنی بقا کا سامان سب سے پہلے اردو کے نام لیوا گھرانوں اور بستیوں میں ڈھونڈنا چاہیے، آنے والے زمانوں میں پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ کھل کر سامنے آئے گی۔ کوئی بھی زبان صرف سرکاری سرپرستی اور بیرونی اسباب کے سہارے زندہ نہیں رہتی۔ سیاست کے موجودہ رخ کو دیکھتے ہوئے، اقتدار کے مراکز کی حقیقت سب پر عیاں ہے۔ کارپوریٹ گھرانے اب ادب، آرٹ، تعلیم، علوم سب کی راہ متعین کرنے پر مصر ہیں۔ ہمیں ڈرنا چاہیے اس لمحے میں اپنے حشر سے جب زبان، علوم، فنون اور تعلیم کے منصوبوں کی کمان صرف سیاست دانوں اور صنعت کاروں کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس وقت ہر طرف، ہر طرف جگہ کم و بیش ایک سا حال ہے۔ اور اردو کے بارے میں تو ہم یہ دعویٰ کرتے کبھی نہیں تھکتے کہ اردو ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیب بھی ہے۔ اس کا دائرۂ اثر مذہبی علوم اور روایت کے گردبے شک پھیلا ہوا ہے، مگر اس زبان کا بنیادی شناختی نشان اس کی آزادروی، اس کی جمہوری قدریں اور سیکولر روایتیں ہیں۔ پچھلے ہزاریے میں اردو کی پیدائش سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک، اس کی لسانی تشکیل اور ادبی سفر کی روداد پلٹتے جائیے، اردو زبان و ادب کے آئینے

میں ہماری جمہوری قدروں اور سیکولر روایتوں کا عکس کہیں بھی دھندلا نظر نہ آئے گا۔ قومی تشخص کا مسئلہ اتنا سادہ نہیں جتنا اوپر سے دکھائی دیتا ہے۔ قومی تشخص اور قومیت کے عناصر ادب اور آرٹ کی دنیا میں لکھنے والے کی انفرادی پہچان اور انفرادیت کے عنصر سے ٹکراتے بھی رہتے ہیں اور ایک خود سر، وحشت آثار، منفرد تخلیقی بصیرتوں سے بہرہ ور لوگوں کے یہاں، اپنے گرد و پیش کی دنیا سے کھینچ تان کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ قومی ادب کے تصور میں بہت سے خطرے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ اردو کی مرکزی روایت کے معماروں نے اسی لیے، اپنے آپ کو، بالعموم کشادہ نظر بنائے رکھا اور محدود وابستگیوں سے محفوظ رہے۔ تاہم، معاملہ متحدہ قومیت کا ہو، ایک نئی ذہنی بیداری اور جدید فکری نشاۃ ثانیہ کا، یا کولونیل دور میں دل و دماغ کی کشمکش اور آویزش کا، برِصغیر کی زبانوں میں اردو ہمیں ہمیشہ پیش پیش دکھائی دیتی ہے۔ مصوری، موسیقی، لوک کلائیں، غرض کہ قومی ثقافت کے کسی بھی مظہر پر نظر ڈالیے، اردو کی جھولی کبھی خالی نہ ہوگی۔ اردو ہماری اجتماعی تاریخ کے سب سے قیمتی اور روشن تجربے کی حیثیت رکھتی ہے، مگر اس طاقت اور تجربے کو بچائے رکھنا شاید بہت آسان نہیں ہے۔ عبداللہ حسین کی اداس نسلوں کے مقدر میں ابھی اور اداس ہونا باقی ہے۔

موجودہ دور میں اردو پر دو طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ ایک تو تاریخ کے بوجھ (baggage) سے نڈھال، علاحدگی پسندی اور تنگ نظری پر مبنی سیاست کی طرف سے، جس نے ہماری جمہوریت اور ہماری سیکولرازم دونوں کو نشانہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ اردو بھی فرقہ پرست طاقتوں کی زد میں ہے۔ اور تعلیمی اداروں میں، دفتری نظام میں، عوامی ذرائع ابلاغ کے محکموں اور شعبوں میں، جہاں اردو کبھی سربلند دکھائی دیتی تھی، اب اس کا سانس لینا بھی دوبھر ہے۔ دوسری طرف کولونائزیشن کے ایک نئے وسیلے کے طور پر اور گلوبلائزیشن (عالم کاری) کے بہانے انگریزی کا بڑھتا پھیلتا دائرہ اور انفرمیشن ٹیکنولوجی کا سیلاب ہے جس نے نجات کے تمام راستے مسدود کر دیے ہیں۔ اس سطح پر اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کا معاملہ تقریباً یکساں ہے۔ ایک مشترک درد اور دہشت، جس کی آنچ کہیں دھیمی ہے کہیں تیز، لیکن اس کے آزار سے محفوظ کوئی نہیں۔ Info-Tech Society کا طوفان بالآخر کہاں جا کر تھمے گا اور کون سی جہت اپنائے گا، یہ مسئلہ ایک علاحدہ بحث کا ہے۔ ڈیوڈ لیون (David Lyon)[۵] کا

خیال ہے کہ ایک سچائی جو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے، یہ ہے کہ کمپیوٹر کی تشکیل بھی ، ایٹم بم اور میزائل کی طرح، فوجی اسٹیبلشمنٹ کی تحریک پر ہوئی تھی۔اس لئے سائنس پر مبنی فلاحی ریاست (Science-based Welfare State) نے بہت جلد سائنس پر مبنی جنگی ریاست (Science-based Warfare State) کی شکل اختیار کرلی۔ہماری وحشت اور بارود کی بو سے بوجھل مستقبل کی گھڑی میں کیا کچھ ہوگا، اس کے تعین کا انحصار، ایک مابعد جدید مفکر کے قول کے مطابق، ہمارے منطقی شعور اور دماغ سے زیادہ ہمارے جذبات پر ہوگا۔ بے شک یہ سچائی اس لائق ہے کہ اسے گرہ میں باندھ لیا جائے۔

اردو کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنانے والوں کے لئے ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں ،دوردیسوں اور علاقوں میں بھی ۔ یوں کتابیں بہ کثرت چھپتی ہیں۔ اخبار اور رسالے پہلے سے زیادہ نکلتے ہیں۔اس آشوب کے نتیجے میں شہر تو شہر جنگل بھی تباہ ہو رہے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ ایک ٹن کاغذ کی حصول یابی کے لیے، کتنے ہزار درخت کاٹے جاتے ہوں گے! مگر اس سے مسئلے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔یہ مسئلہ ہے ایک عام تخلیقی اضمحلال اور ناداری کا، جس سے ہمارا پورا ادبی معاشرہ دوچار ہے۔بُرا ادب پیدا کرنے کی طاقت سے ہر زمانے میں بہت لوگ مالا مال رہے ہیں لیکن آج سے پہلے وہ کبھی اپنے آپ سے اتنے مطمئن اور شادکام نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارا نصیب کہ زمانہ ان کی توقیر میں اضافے کا ہے۔کیا قیامت ہے کہ سنجیدہ، معنی خیز اور ہماری بصیرتوں کو جگانے والی ادبی تخلیق ہمیں اب مستقلاً ڈھونڈنی پڑتی ہے ،اپنی زبان اور دوسری ملکی غیر ملکی زبانوں میں گھٹیا ادب ،افواہیں اور خبر نامے ہوا کے شور کے ساتھ خود بہ خود ہم تک پہنچ جاتے ہیں۔کیسے کیسے جاندار اگرچہ بہ ظاہر معمولی، نحیف ونزار نظر آنے والے رسالے فراموش کاری اور بدمذاقیوں کی دھند میں کھو گئے اور اب ہم انھیں تاریخی نوادر اور اپنی زبان کے میوزیم Pieces یا آثار کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ہماری زبان کی سنہری فصلیں اور زمانے کتنی جلدی رخصت ہو گئے۔ یہ سوال اردو کے ادیب اور قاری اور صحافی ،ان سب کے سوچنے کا ہے۔میں تو فی الحال، اپنے ایک ہم عصر چیک ادیب، مروسلاو ہولب کے اس قول پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ جب آزادی، وٹامن سی، خیال کی ترسیل، نظامِ قانون اور ہائی بلڈ پریشر کے علاج کی ضرورت

بہت بڑھ جاتی ہے تو شاعروں (ادیبوں اور اچھے قاری) کی بھی بہت ضرورت ہوتی ہے۔سو، ہماری زبان اور ہماری ادبی روایت بھی اس وقت بہت سی ضرورتوں میں گھری ہوئی ہے۔!

حواشی

* پروفیسر ایمریطس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، انڈیا۔

۱۔ ڈیریک والکاٹ (Derek Walcott) ویسٹ انڈیز کے ایک شاعر، ڈراما نگار اور فن کار ہیں جنھیں ۱۹۹۲ء میں نوبل انعام اور ۲۰۱۱ء میں ایلیٹ پرائز دیا گیا۔

۲۔ علامہ محمد اقبال کی یہ تقریر یکم جنوری ۱۹۳۵ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی۔

۳۔ حسن عسکری، "تقسیم ہند کے بعد" مشمولہ مجموعۂ حسن عسکری (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۱۳۵۔

۴۔ حسن عسکری، عسکری نامۂ افسانے، مضامین، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۸۸۔

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈیوڈ لیون (David Lyon)، *The Information Society: Issues and Illusions* (وائلی Wiley، ۱۹۹۱ء)۔

(اردو کانفرنس، ایکسپریس نیوز، لاہور میں ۱۱۵ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو پڑھا گیا)

مآخذ

عسکری، محمد حسن۔ "تقسیم ہند کے بعد"۔ مجموعۂ حسن عسکری۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

______۔ عسکری نامہ: افسانے، مضامین۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

لیون، ڈیوڈ (Lyon, David)۔ *The Information Society: Issues and Illusions*۔ وائلی Wiley، ۱۹۹۱ء۔